سلیم خاں گمی

اقبال اور تہذیبِ حاضر

حضرت علامہ اقبال گرم و سرد چشیدہ تھے، ایک زمانہ دیکھا تھا، کئی سال مغرب میں رہے، مغربی اداروں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، شہر شہر قریہ قریہ گھومے، دانش وروں، ادیبوں اور حکیموں سے ملے، قدر و منزلت پائی، کئی امور و معاملات جن سے ہمارا واسطہ نہ پڑا ان کے مشاہدہ و تجربہ میں آئے۔ وہ اہلِ فرنگ یا اہلِ یورپ کی خوبیوں اور خامیوں سے کماحقہٗ آگاہ تھے۔ انھوں نے اہلِ فرنگ کی فکری تحریکوں کا مطالعہ کیا تھا۔ مغربی دنیا کے مذہبی مسلکوں کا قریب سے تقابلی مطالعہ کیا تھا، وہ عالمی ادیان سے بہت متعارف تھے۔ یہ باتیں ذہن میں تھیں جب ہرمن ہیس نے حضرت علامہ اقبال کے متعلق یہ لکھا کہ وہ فکر و دانش کی تین سلطنتوں کے فرماں روا ہیں۔ (۱) ہندی فکر (۲) مغربی فکر اور (۳) اسلامی فکر، اتنا بڑا مفکر جب اپنی جچی تلی ہوئی رائے پیش کرتا ہے تو ایک دنیا کیا پوری دنیا کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے۔

علامہ اقبال جب تہذیب حاضر کا ذکر کرتے ہیں تو لامحالہ ان کی مراد تہذیب فرنگ سے ہے یعنی اہلِ یورپ کا فکری نظام اور اس فکری نظام کے تحت رواں دواں مختلف ادارے، خواہ یہ ادارے سیاسی ہوں خواہ اقتصادی۔ سماجی ہوں یا تفریحی۔ علامہ ان پر اپنی رائے دو ٹوک انداز میں دیتے ہیں۔

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں   بھڑک اٹھا بھبھوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے   یہ رعنائی یہ بیداری یہ آزادی یہ بے باکی

تو تہذیب حاضر کے اثرات نوجوانوں پر کیا مرتب ہوئے، شوخی و شرارت۔ آپ چاہیں تو اس زمرے میں ہڑتالیں، توڑ پھوڑ کی کاروائیاں اور تشدد آمیز جتھہ بندیاں بھی لا سکتے ہیں، یہ تو تھی بات رعنائی کی۔ بیداری میں ملحدانہ خیالات و افکار آتے ہیں۔ مارکس، لینن، ماؤ اور چی گویرا کے خیالات اور کردار کی پسندیدگی اور سرپرستی۔ آزادی سے مراد مادر پدر آزادی ہے۔ یہ آزادی بدتمیزی اور بدقماشی کا دوسرا نام ہے۔ بے باکی، جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے کی جرأت و بے باکی نہیں،

بڑوں اور بزرگوں کی آرا سے اختلاف کا دوسرا نام ہے۔ اساتذہ اور والدین کے احترام سے کنارہ کشی کو بھی بے باکی ہی تصور کیا جائے گا۔ تہذیبِ حاضر نے یہ "تحائف" تو نوجوانوں کو دیے ہیں۔ اگر آپ کو لفظ "تحائف" پر اعتراض ہے تو آپ اسے زہر کہہ لیجیے۔ اقبال نے اِسے زہر ہی کا نام دیا ہے:

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام
آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب، اے انقلاب!

تہذیبِ حاضر نے مسلمان نوجوانوں کو خصوصاً طلبا کو تین چیزیں اور دی ہیں۔ وہ ہیں:
(۱) بے ثباتی (۲) بے یقینی (۳) بے حضوری۔ علامہ فرماتے ہیں:

دورِ حاضر مستِ چنگ و بے سُرور — بے ثبات و بے یقین و بے حضور

نوجوانوں کے اذہان و قلوب میں یہ عوارض کیوں پیدا ہوئے؟ اس لیے کہ نوجوانوں نے اسلام کی حیات آموز تعلیمات پر عمل پیرا ہونے والے اسلاف کی میراث کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا:

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی — ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

تہذیبِ حاضر نے عہدِ حاضر کو بے حیا کر دیا ہے۔ کیفیت یہ ہے کہ حضرت علامہ اقبال دعا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی — خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

نوجوانوں کے لیے حضرت علامہ کے پاس خصوصی پروگرام بھی ہے۔ وہ کیا ہے؟

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے — صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

آج کا نوجوان "لا الہ الا اللہ" پر عمل پیرا ہو کر تہذیبِ حاضر کی آلائشوں سے نہ صرف پاک رہ سکتا ہے بلکہ اُن کو ختم بھی کر سکتا ہے۔ یہی بات ایک اور طرح سے کلامِ اقبال میں ادا ہوئی ہے:

جوہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف — تعلیم ہو گو فرنگیانہ
شاخِ گل پر چہک — ولیکن — کر اپنی خودی میں آشیانہ

ایک دوسری جگہ فرمایا:

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن — قدم اُٹھا! یہ مقام انتہائے راہ نہیں

کھلے ہیں سب کے لیے غربیوں کے میخانے — علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

اس سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری — تیرے بدن میں اگر سوزِ لاالہ نہیں

علامہ اقبال مرض کا اعلان کرتے ہیں ۔ پوری توجہ سے مرض کی تشخیص کرتے ہیں، نسخہ بتاتے ہیں تاکہ شفا ہو۔ پرہیز بھی بیان کر دیا جاتا ہے ۔ اس کے باوجود اگر تہذیب حاضر کے والا و شیدا اس طرف متوجہ نہ ہوں تو وہ پکار اٹھتے ہیں :

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں — نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

ظاہر ہے اس کے بغیر کوئی دوسرا چارۂ کار بھی نہیں۔

اہلِ فرنگ نے ہم مسلمانوں کو ایک اور تہذیبی تحفہ دیا ہے جسے مغربی فلسفہ کہا جاتا ہے۔ اقبال اسے حکمتِ مغرب کہہ کر یاد کرتے ہیں ۔ اس مغربی فلسفے پر چل کر ہماری جو دُرگت ہوئی، اس کے متعلق فرمایا :

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی — ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

دریں چہ شک ۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی بھی اسی حکمتِ مغرب کی مرہونِ منت ہے ۔ لسانی اور ثقافتی تفرقہ بازی کے جو افکار و تصورات آج کے افق سیاست پر اُڑتے نظر آتے ہیں، یہ مغربی علم السیاست ہی کی تو دین ہیں ۔ جن دنوں ہندی مسلمان اپنے حقوق کے لیے انگریزوں سے سرزمینِ ہند میں برسرِ پیکار تھے ان دنوں سیاسی اصطلاحوں کی شکل میں انگریزوں نے جو کچھ کیا اس کا ذکر اقبال نے اپنے ایک طنزیہ شعر میں یوں کیا ہے :

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

حضرت علامہ اقبال نے تہذیبِ حاضر کو "کارگہِ شیشہ گراں" بیان کیا ہے ۔ اس کارگاہِ شیشہ گراں کے شب و روز کیا ہیں؟ کلامِ اقبال سے ان کا پتا یوں چلتا ہے :

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟ — دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک

نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں — چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گلگونہ فروش

یہ مدرسہ یہ کھیل یہ غوغائے رو ا رو اس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نو
وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آزرانہ

یہ حُوریانِ فرنگی، دل و نظر کا حجاب بہشتِ مغربیاں، جلوہ ہائے پا بر کاب

تہذیبِ حاضر کی ایک اور خصوصیت ملوکیت یا نوآبادیاتی نظام ہے۔ اہلِ یورپ تجارت اور سوداگری کا لبادہ اوڑھ کر آتے تھے اور ملکوں اور قوموں پر ملوکانہ قبضہ کر لیتے تھے۔ ہندوستان میں یہی کچھ ہوا۔ تاجر کے بھیس میں آئے۔ پہلے سازش سے پھر تلوار سے کام لیا اور بحرِ ہند سے بلتستان تک سارے ہندوستان کے مالک بن گئے۔ علامہ اقبال نے اس لائحہ عمل کو "تختہ' دکاں شریکِ تخت و تاج" بیان فرمایا ہے۔ ایک دوسری جگہ وہ اس سیاست گری یا تجارت گری کو قاہری اور سوداگری کے الفاظ سے بیان کرتے ہیں۔ کیا زوردار مصرع ہے ع

قاہری در عصرِ حاضر سوداگری است

سوداگری قاہری کیونکر بنتی ہے؟ یوں کہ فکرِ ملوکانہ ایسی ہی ایجاد چاہتا ہے۔ فکرِ ملوکانہ کی آرزو اور کوشش سے سوداگری قاہری کا روپ دھار لیتی ہے۔ ایک دوسری جگہ علامہ نے فکرِ ملوکانہ کی طرف یوں اشارہ فرمایا:

یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد

مزے کی بات یہ ہے کہ تہذیبِ حاضر تلبیس کے فن میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ ملوکیت اور قاہری کے ساتھ ساتھ مساوات کا سبق بھی دیا جاتا ہے تاکہ جن پہ مشق ناز ہو رہی ہے ان کو پتا تک نہ چلے کہ درحقیقت ان کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ استعماریت، ملوکیت، قاہری، آبادیت یا نوآبادیت کے پیروکار محکوم لوگوں اور قوموں کا خون بھی چوستے ہیں اور مساوات کا درس بھی دیتے ہیں:

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات

یورپ کا سماجی نظام سرمایہ دارانہ نظام ہے، اس کی بنیاد مادہ پرستی ہے۔ ہر طرف پیسے کی حکمرانی ہے۔ پیسہ کمانے کے لیے دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ قوموں کو غلام بنایا جا سکتا ہے۔ ایڈم سمتھ نے مغربی دنیا کا اقتصادی نظام ترتیب دیا ہے۔ اس نے "دولتِ اقوام" نام کی کتاب میں جو کچھ لکھا اس پر آج بھی شد و مد سے عمل ہو رہا ہے۔ اقتصادی بلندی اور اقتصادی پستی مغرب کے سماجی رویے طے کرتی ہے۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ امیر، امیر تر کیوں بن رہا ہے، غریب، غریب تر کیوں بن گیا ہے۔ مساوات کا صرف نام لیا جاتا ہے، اس پر عمل کوئی نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اسلام بندہ گری، بندہ پروری اور بندہ نوازی کا قلع قمع کرتا ہے۔ اس طرف حضرت علامہ اقبال نے یوں اشارہ فرمایا ہے:

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

اقبالؒ حکمتِ مغرب کی پیدا کردہ مدنیت کو ختم کرنے کے آرزومند ہیں۔ وہ ایک نئی دنیا پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی دنیا جو حکمت قرآن کے مطابق ہو۔

عالمے در سینۂ ما گم ہنوز عالمے در انتظارِ قم ہنوز

مغربی دنیا کی تاخت و تاراج کا اصل سبب کیا ہے؟ ظاہر ہے جدید سائنس اور ٹکنالوجی جس کی بدولت اہل مغرب نے مشین پیدا کی۔ مشین کی بدولت صنعتی انقلاب آیا۔ صنعتی انقلاب نے اپنے مخصوص دور کا اخلاق تخلیق کیا، اس اخلاقی نظام نے خدا کو نظر انداز کیا اور اقتصادی دانش نے انسان کو حیوان بنا دیا۔ گویا اہلِ مغرب کی مشینوں کی بدولت اقتصادی حیوان کو جنم دیا ہے۔ آج مسلمان کا مقابلہ اسی اقتصادی حیوان سے ہے جو تہذیبِ حاضر کا خالق بھی ہے اور بندہ بھی۔

علامہ اقبال نے اس کیفیت کو تمثیلی شکل عطا کی ہے۔ ایک بوڑھا بلوچ اپنے بیٹے کو یوں نصیحت کرتا ہے،

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

دین ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت — ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا
دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش — تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا — ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اساسیاتِ اسلام

مولانا محمد حنیف ندوی

اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں اور کس حد تک ان سے فرد و معاشرے کے تقاضے پورے ہوتے ہیں؟ موجودہ دور کے غلط علمی رجحانات نے کن غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے اور اسلام کے نقطۂ نظر سے ان کا کیا جواب ہے؟ اسلام علوم و فنون کے ارتقا کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور عقیدہ و عمل کے وہ کون سے خطوط ہیں جو انسانیت کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں؟

اساسیاتِ اسلام میں ان سوالات سے متعلق بڑے یقین پرور اور پُر اثر اسلوب میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں ان تمام مشکلات کا تسلی بخش حل پایا جاتا ہے، جن سے کہ آج نوعِ انسانی دوچار ہے۔

صفحات ۱۶+۲۸۴ قیمت ۲۵ روپے

اسلام اور فطرت

مولانا محمد جعفر پھلواروی

اسلام کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے۔ لیکن فطرت کیا ہے اور اسلام کیونکر فطرت کے مطابق ہے۔ اس کتاب میں اسی اہم موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

صفحات ۸+۱۲۴ قیمت ۸ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور